ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

علی امام نقوی: نقش (انسانی زندگی کی شکست وریخت، اجتماعی نفسیاتی مطالعہ)

Ali Imam Naqvi: Role (The Failure and Destruction of Human Life, A Social Psychological Study)

عمران خان
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور

Imran Khan
Ph.D Scholar, Department of Urdu
Lahore Leads University, Lahore.

ڈاکٹر عائشہ مقصود
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور

Dr. Ayesha Maqsood
Assistant Professor, Department of Urdu,
Lahore Leads University, Lahore.

Abstract:

This article presents a comprehensive psychological and sociological analysis of Ali Imam Naqvi's acclaimed short story, "Naqsh", contextualizing it within the landscape of modern 21st-century Urdu fiction. Moving ,beyond mere external realism, Naqvi's narrative deeply explores the subconscious conflicts, repressed desires and psychological traumas that dismantle the contemporary family unit. The study critically examines the intricate character dynamics through a psychoanalytical lens: the highly educated yet domineering mother-in-law, who embodies toxic traditionalism and the oppressive societal Super-Ego; the son, whose psychological impotence stems from childhood conditioning and over-parenting; and the daughter-in-law, who serves as a ,poignant metaphor for suppressed emotional and sexual frustration within a patriarchal setup. Furthermore the article highlights the pivotal role of clinical psychology and 'Talk Therapy' used by the physician in the ,story, which bypasses superficial medical diagnoses to unearth the root causes of the marital crisis. Ultimately the research concludes that "Naqsh" transcends the tragedy of a single household to become a profound critique of the collective unconscious of South Asian society. It exposes the hypocrisy of a system where advanced academic degrees fail to eradicate regressive mindsets, emphasizing the dire need for emotional .intelligence, interpersonal communication, and psychological freedom for the survival of familial bonds

- **Key words:** ,Ali Imam Naqvi, Modern Urdu Fiction, Psychoanalysis, Family Dynamics ,Subconscious Conflicts, Sexual Frustration, Talk Therapy, Collective Unconscious Traditional Mindset, Psychological Realism.

اردو فکشن کے ارتقائی سفر پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ اس صنف نے داستانوی طلسمات اور مافوق الفطرت عناصر سے نکل کر بتدریج انسانی ذات کے پیچیدہ اور گنجلک مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اکیسویں صدی کا جدید اردو افسانہ محض خارجی واقعات کی تصویر کشی کا نام نہیں رہا، بلکہ یہ انسانی ذہن کے تاریک گوشوں، لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں اور نفسیاتی کشمکش کا ایک مستند اشاریہ بن چکا ہے۔ اس عہد کے افسانہ نگاروں نے روایتی بیانیے سے انحراف کرتے ہوئے فرد کی داخلی دنیا کو دریافت کرنے کو اپنا مقصودِ فن گردانا ہے۔

عصری حسیت کے زیرِ اثر جدید فکشن میں انسان کی تنہائی، ذات کا بحران، عدم تحفظ کا احساس اور وجودی کرب ایسے موضوعات ہیں جو براہِ راست نفسیاتی محرکات کے تابع ہیں۔ صنعتی ترقی، ٹیکنالوجی کی یلغار اور گلوبلائزیشن نے جہاں انسان کو مادی آسائشیں فراہم کی ہیں، وہیں اسے جذباتی طور پر کھوکھلا اور نفسیاتی طور پر مضطرب بھی کر دیا ہے۔ آج کا افسانہ نگار کسی ماہرِ نفسیات کی طرح اپنے کرداروں کو ان کے فطری ماحول میں رکھ کر ان کے اعمال کے پسِ پردہ چھپی ہوئی لاشعوری گتھیوں کو کھولنے کی سعی کرتا ہے۔

تحلیلِ نفسی کے بانی سگمنڈ فرائڈ اور اس کے بعد کارل یونگ اور الفریڈ ایڈلر کے نظریات نے عالمی ادب کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کو بھی ایک نیا شعور

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

بخشا۔ ان نظریات کی بدولت افسانہ نگاروں نے یہ ادراک حاصل کیا کہ انسان کا کوئی بھی عمل، چاہے وہ بظاہر کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، اپنے اندر ایک طویل نفسیاتی تاریخ رکھتا ہے۔ جدید فکشن میں کرداروں کی ذہنی بنت کو سمجھنے کے لیے ان کے لاشعور میں دبی ہوئی خواہشات، بچپن کے صدمات اور سماجی دباؤ کے تحت پیدا ہونے والے احساسِ کمتری کا مطالعہ ناگزیر ہو چکا ہے۔ بقول نازیہ ظہور:

> "نفسیات انسان کی اندرونی کیفیات، ذہنی واردات اور اس کے خارجی اعمال وافعال کا براہِ راست یا بالواسطہ مطالعہ کرتی ہے۔ کائنات کا اصل محور اور دلچسپی کا مرکز انسان کی ذات ہے چنانچہ نفسیات انسان اور اس کے کردار کو موضوع بناتی ہے جو ایک جان دار کی حیثیت سے اس تغیر پذیر دنیا میں عمل پیرا ہوتا ہے۔"(1)

مذکورہ بالا سائنسی اور فکری نقطہ نظر نے اردو افسانے کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا۔ اب کہانی کا مقصد محض قاری کو محظوظ کرنا نہیں رہا، بلکہ اسے سوچنے اور انسانی رویوں کی تفہیم پر مجبور کرنا ہے۔ کرداروں کے اعصابی تناؤ، ان کے فراری رویے اور انشقاقِ ذہنی ایسی کیفیات افسانے کے پلاٹ میں اس طرح پیوست ہو چکی ہیں کہ کہانی اور نفسیاتی کیس ہسٹری کے درمیان حدِ فاصل معدوم ہوتی محسوس ہوتی ہے۔

اس بدلے ہوئے منظر نامے میں سماجی اور نفسیاتی جبر کا باہمی تصادم ایک اہم موضوع بن کر ابھرا ہے۔ معاشرتی اقدار، رسوم ورواج اور خاندانی توقعات فرد کی انا(Ego) کو اس حد تک مجروح کر دیتے ہیں کہ وہ دفاعی میکانزم کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہی دفاعی تدابیر بعض اوقات اسے معاشرے میں ایک غیر معمولی یا ابنارمل کردار کے طور پر پیش کرتی ہیں، جس کی اصل وجہ اس کا داخلی خوف اور گھٹن ہوتی ہے۔ جدید اردو افسانے میں کلینکل نفسیات کا استعمال ایک طاقتور رجحان کے طور پر سامنے آیا ہے۔ افسانہ نگار کرداروں کو محض ایک کٹھ پتلی کے طور پر پیش کرنے کے بجائے ان کے نفسیاتی پس منظر کی مکمل نقاب کشائی کرتا ہے۔ اس عمل میں کرداروں کے مکالمات، ان کی خاموشی اور ان کی حرکات وسکنات ان کی الجھی ہوئی نفسیات کا پردہ چاک کر دیتی ہیں:

> "فرد کا اس کے فطری ماحول میں مطالعہ کرنا کلینیکی نفسیات کا نصب العین بن گیا... ان لاشعوری نفسی عوامل کا انکشاف ہونے لگا جن پر ماہرین نفسیات کی نگاہ اس وقت تک نہیں پڑ سکی تھی اور ایسے افعال وکردار کی گرہیں کھلنے لگیں جو ہنوز معمہ بنے ہوئے تھے۔"(2)

اس کلینیکی اور تجزیاتی روش نے اردو افسانے میں جس نئے دور کا آغاز کیا، اس میں علی امام نقوی کا نام نہایت نمایاں اور وقیع حیثیت کا حامل ہے۔ انہوں نے روایتی ترقی پسندی اور پیچیدہ جدیدیت کے بین بین اپنا ایک ایسا منفرد راستہ تراشا، جو خالصتاً انسانی نفسیات اور سماجی حقیقت نگاری کے امتزاج پر مبنی ہے۔ ان کے افسانے موجودہ دور کے انسان کے انفرادی اور اجتماعی المیوں کی نہایت متوازن اور گہری تصویر پیش کرتے ہیں۔

علی امام نقوی کا قلم معاشرے کے ان کرداروں پر نشتر زنی کرتا ہے جو بظاہر پڑھے لکھے اور مہذب نظر آتے ہیں، لیکن اندرونِ ذات وہ فرسودہ سماجی رویوں، جھوٹی انا اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے کرداروں کی کشمکش محض روٹی کپڑے کا مسئلہ نہیں، بلکہ ان کی شناخت، عزتِ نفس اور خاندانی رشتوں کی بقا کی جنگ ہے۔ وہ درمیانے طبقے کی نفسیات کو اتنی باریک بینی سے پیش کرتے ہیں کہ قاری خود کو ان کرداروں کے روپ میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ ان کے افسانوں میں کردار نگاری کوئی مصنوعی یا میکانکی عمل نہیں، بلکہ وہ اپنے کرداروں کے لاشعور تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ خاندانی سیاست، نسل کشی کا خوف اور رشتوں کے درمیان حائل عدم اعتماد کی خلیج کو وہ جس چابک دستی سے بیان کرتے ہیں، وہ ان کی نفسیاتی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ محض جذباتیت کا سہارا لے کر سستی ہمدردی سمیٹنے کے قائل نہیں، بلکہ وہ ایک ماہر سرجن کی طرح معاشرتی ناسور کی جڑ تک پہنچتے ہیں۔ ڈاکٹر عبید اللہ چودھری لکھتے ہیں:

> "علی امام نقوی جدید دور کے ان افسانہ نگاروں میں ہیں جو کمزور طبقات کی زندگی میں پیش آنے والے مصائب پر قلم اٹھاتے ہیں... وہ اعتدال سے کام لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی ایک سنجیدہ حقیقت ہے۔"(3)

نقوی کی اسی اعتدال پسندی اور سنجیدگی نے ان کے فکشن کو ایک ابدی اور آفاقی رنگ دیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ زندگی کے المیے چیخ وپکار کے محتاج نہیں ہوتے، بلکہ خاموشی اور سرد مہری کے رویے بعض اوقات زیادہ ہولناک نفسیاتی تباہی کا سبب بنتے ہیں۔ ان کا شاہکار افسانہ 'نقش' اسی خاموش تباہی، خاندانی شکست وریخت اور سماجی دباؤ کے تحت پنپنے والے نفسیاتی امراض کی ایک اعلیٰ ترین مثال ہے، جہاں پڑھے لکھے کردار بھی دقیانوسی سوچ کے باعث اپنے ہی وجود کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ ان کے فکشن کا کینوس اگرچہ بظاہر شہری زندگی اور عائلی مسائل پر مبنی دکھائی دیتا ہے، لیکن اس کی جڑیں پورے معاشرے کے اجتماعی لاشعور میں پیوست ہیں۔ وہ اس سچائی کو منکشف کرتے ہیں کہ ترقی اور تہذیب کے دعووں کے باوجود آج کا انسان اندر سے کس قدر غیر محفوظ اور خوفزدہ ہے۔ رشتوں کا بکھراؤ، عدم برداشت اور اپنی ذات کے

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

خول میں قید ہو جانے کا عمل ان کے افسانوں کا بنیادی خمیر ہے:

"اقدار کے زوال، ماحول میں بے چینی، خوف و دہشت، ذات کے بحران، معاشی نابرابری، طبقاتی کشمکش، نفرت کے ماحول، بددیانتی، بے اعتباری اور سیاسی جبر واستبداد کے درمیان ہم عصر افسانوں کے مطمحِ نظر میں تبدیلی رونما ہوئی ہے۔"(4)

مذکورہ بالا عصری منظر نامے اور تہذیبی بحران کو علی امام نقوی نے پوری فنی ایمانداری کے ساتھ اپنے قلم کی زد میں لیا ہے۔ ان کا فکشن اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ نہ صرف انسانی جبلتوں کے مدوجزر سے بخوبی واقف ہیں بلکہ ان جبلتوں پر پڑنے والے معاشرتی اثرات کا تجزیہ کرنے پر بھی کمالِ قدرت رکھتے ہیں۔ جدید اردو افسانے کی تاریخ ان کی نفسیاتی ژرف نگاہی، معروضی نقطہ نظر اور انفرادی اسلوب کے تذکرے کے بغیر ہمیشہ نامکمل رہے گی، کیونکہ انہوں نے کرداروں کی شکست و ریخت کو محض ایک کہانی کے طور پر نہیں بلکہ ایک وسیع تر سماجی اور اجتماعی المیے کے طور پر پیش کر کے اردو فکشن کو ایک نئی معنویت اور اعتبار بخشا ہے۔

علی امام نقوی کا افسانہ "نقش" معاصر اردو فکشن میں ایک ایسی بے مثال اور تہہ دار تخلیق ہے جو گھریلو زندگی کے بظاہر پرسکون اور ہموار نظر آنے والے ماحول کے پسِ پردہ کارفرما ہولناک نفسیاتی طوفانوں کی پردہ دری کرتی ہے۔ یہ کہانی محض ایک طبی یا نفسیاتی الجھن کا بیان نہیں، بلکہ اسے عہدِ حاضر کے خاندانی نظام کے کھوکھلے پن، باہمی رشتوں کی عدم تفہیم اور ایک ہی چھت تلے رہتے ہوئے ذہنی و جذباتی تنہائی کا ایک بلیغ استعارہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ افسانہ نگار نے نہایت چابک دستی سے ایک ایسے المیے کو قرطاس پر اتارا ہے جو شور و غوغا کے بجائے خاموشی سے انسانی رشتوں کی جڑیں کاٹ رہا ہے۔ افسانے کا عنوان "نقش" اپنے اندر گہری استعاراتی اور رمزیہ معنویت رکھتا ہے۔ یہ وہ نقش ہیں جو بچپن کی تربیت، ماں کی بے جا حساسیت اور خاندانی گھٹن نے بیٹے کے لاشعور پر ثبت کر دیے ہیں۔ ان نقوش نے اس کے فطری ارتقا کو روک کر اسے ایک ایسا محتاط اور خائف انسان بنا دیا ہے جو اپنی بیوی کے لیے بھی ایک معمہ ہے۔ یہ کہانی ان تمام غیر مرئی زنجیروں کی نشاندہی کرتی ہے جو خاندانی نظام کے نام پر افراد کے گرد لپیٹ دی جاتی ہیں، جن میں سانس لینا تو ممکن ہوتا ہے لیکن جینا محال ہو جاتا ہے۔

اس افسانے کا بنیادی کینوس ایک متوسط یا اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے کی اس محرومی پر استوار کیا گیا ہے جو شادی کے کئی برس گزر جانے کے باوجود اولاد جیسی نعمت سے تہی دامن ہے۔ اولاد کی آرزو، جو مشرقی عائلی نظام میں خاندان کی بقا اور ازدواجی رشتے کی مضبوطی کی سب سے بڑی ضمانت سمجھی جاتی ہے، اس گھرانے کے لیے ایک ایسا مستقل عذاب بن چکی ہے جس نے رشتوں کی فطری مٹھاس کو زہر آلود کر دیا ہے۔ لیکن مصنف کا کمال یہ ہے کہ وہ اس محرومی کو کسی جسمانی نقص سے جوڑنے کے بجائے اسے ایک گہرے نفسیاتی عارضے کے طور پر پیش کرتا ہے۔ جدید میڈیکل سائنس اور اس کی تمام تر ترقی یافتہ لیبارٹریاں، جو انسانی جسم کے خلیوں کا تو بخوبی تجزیہ کر سکتی ہیں، لیکن انسانی ذہن پر پڑے ہوئے ان انمٹ نقوش کو پڑھنے سے قاصر رہتی ہیں جو رشتوں کے غیر فطری دباؤ کے تحت بنتے ہیں۔ افسانے میں بیٹا اور بہو بظاہر بالکل تندرست ہیں، ان کے تمام طبی ٹیسٹ مثبت ہیں، مگر ان کی ازدواجی زندگی ایک پراسرار بانجھ پن کا شکار ہے۔ یہی وہ موڑ ہے جہاں سے افسانہ جسمانی امراض کی حدود سے نکل کر نفسیاتی اور عائلی شکست و ریخت کے دائرے میں داخل ہوتا ہے:

"میں اعتراف کرتا ہوں، ابھی تک نہ جان سکا ان دونوں میں مریض کون ہے؟ ایلوپیتھی فزیشین نے حسب روایت دسیوں رپورٹس کی فائل بنائی پھر بھی نہ جان پائے ان میں بیمار کون ہے۔ کچھ رپورٹس سے بیٹے، بہو اور ماں کو اس کا یقین ہو گیا کہ بیٹے میں عیب ہے نہ بہو میں خامی۔ دو ایک ٹیسٹ میں نے بھی کروائے اور پھر اعتراف کر رہا ہوں یہ پیچیدہ کیس ہے۔"(5)

مذکورہ بالا اقتباس اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ جب خاندانی نظام میں جذباتی گھٹن اور نفسیاتی دباؤ حد سے بڑھ جائے، تو جسمانی صحت مندی بھی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ فزیشن کی ناکامی دراصل ان روایتی سماجی پیمانوں کی ناکامی ہے جو ہر مسئلے کا حل مادی یا ظاہری اسباب میں تلاش کرتے ہیں۔ یہ پیچیدہ کیس اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک خاندانی رشتوں کے اندرونی تانے بانے اور ان میں موجود عدم توازن کو نہ سمجھا جائے، تب تک کسی بھی فرد کی کھوئی ہوئی طمانیت کو بحال نہیں کیا جا سکتا۔

افسانے کی بنت میں تین بنیادی کردار (ساس، بہو اور بیٹا) ایک ایسی مثلث تشکیل دیتے ہیں جس کا ہر زاویہ ایک دوسرے سے متصادم ہے۔ ڈاکٹر کے کلینک میں ان تینوں کی موجودگی، ان کی پراسرار خاموشی، ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھنے کا عمل اور موبائل نمبر لکھتے وقت ان کی ہچکچاہٹ، یہ سب گھریلو زندگی کے اس شدید تناؤ کی عکاسی کرتے ہیں جہاں کوئی فرد بھی اپنے حقیقی جذبات کے اظہار کی آزادی نہیں رکھتا۔ یہ خاموشی اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے درمیان مکالمے کا فقدان ہے۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

خاندانی نظام میں جب ایک فرد کی حاکمیت یا اس کی بے جا توقعات دیگر افراد کی شخصی آزادی اور فطری نشوونما کو سلب کر لیں، تو پورا گھرانہ ایک نفسیاتی قید خانے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ افسانے میں ماں کا کردار، جو بظاہر اپنے بیٹے کی فلاح اور اولاد کی تمنا میں سرگرداں ہے، درحقیقت اسی حاکمیت اور تسلط کی وہ علامت ہے جس نے غیر ارادی طور پر اپنے ہی بیٹے کی ازدواجی زندگی کو مفلوج کر دیا ہے۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت ہونے کے باوجود، اس کا طرزِ عمل ایک ایسی جابرانہ مداخلت پر مبنی ہے جو بیٹے کی نجی زندگی کی حدود کو پامال کر رہی ہے۔ عائلی زندگی کی بقا کے لیے میاں اور بیوی کے درمیان جس ذہنی، جذباتی اور جسمانی ہم آہنگی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ کسی بھی بیرونی دباؤ کے سائے میں پروان نہیں چڑھ سکتی۔ جب ایک مرد، جو بچپن سے ہی ایک غالب اور کڑی نگرانی کرنے والی ماں کے زیرِ اثر رہا ہو، شادی کے بندھن میں بندھتا ہے، تو وہ اپنی شریکِ حیات کے ساتھ وہ فطری اور بے تکلفانہ رشتہ استوار کرنے میں شدید رکاوٹوں کا سامنا کرتا ہے کیونکہ اس کے لاشعور میں ہر وقت ایک غیر مرئی احتیاط اور خوف موجود رہتا ہے۔ اس بابت محقق مبین عنایت لکھتے ہیں:

> "سماجی و نفسیاتی مسائل صرف ظاہری زندگی کو نہیں بلکہ فرد کے باطن یعنی اندرونی دنیا اور داخل یعنی فرد کی نفسیاتی و روحانی کیفیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔... جب فرد معاشرے کے دباؤ کا شکار ہوتا ہے تو وہ اپنے قریبی رشتوں جیسے شوہر، بیوی، والدین یا بچوں سے احساس، توجہ چھین لیتا ہے۔ یہ محرومی رشتوں میں احساس بیگانگی اور دوری پیدا کرتی ہے۔ جس سے عائلی زندگی میں کشیدگی بڑھ جاتی ہے۔"(6)

اس تحقیق کی روشنی میں جب ہم افسانے کے کردار 'بیٹے' کا جائزہ لیتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ وہ اسی باطنی اور نفسیاتی محرومی کا شکار ہے۔ ماں کے بے تحاشا لاڈ پیار، اس کے ہر عمل پر کڑی نظر اور ضرورت سے زیادہ احتیاط نے بیٹے کے اندرونی مردانہ اعتماد کو متزلزل کر دیا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے لیے ایک شوہر کے بجائے ایک ایسا خوفزدہ وجود بن چکا ہے جو ازدواجی قربت کے لمحات میں بھی اس غیر ضروری 'احتیاط' کے حصار سے باہر نہیں نکل پاتا جسے اس کی ماں نے برسوں کی تربیت سے اس کے ذہن پر نقش کر دیا ہے۔ دوسری جانب بہو کا کردار ایک ایسی خاموش اور مظلومیت کی تصویر ہے جو عائلی جبر کی چکی میں پس رہی ہے۔ وہ ایک جیتی جاگتی، محسوس کرتی ہوئی عورت ہے، جس کے اندر ممتا کے خواب اور ازدواجی رفاقت کی فطری پیاس موجود ہے۔ لیکن اسے ایک ایسے گھرانے میں لا بٹھایا گیا ہے جہاں اس کا شریکِ حیات اس قدر نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہے کہ وہ اس کی پیاس بجھانے سے قاصر ہے۔ بہو کی یہ محرومی محض جسمانی نہیں، بلکہ یہ اس کی پوری شخصیت کی نفی اور اس کے وجود پر ایک سوالیہ نشان ہے۔

عورت جب خاوند کی رضا میں راضی ہونے کے مشرقی تصور کے تحت اپنی تمام تر جنسی اور جذباتی ناآسودگیوں کو خاموشی سے پی لیتی ہے، تو یہ خاموشی اس کی روح کو دیمک کی طرح چاٹنے لگتی ہے۔ افسانے میں بہو کا ڈاکٹر کے سامنے یہ اعتراف کہ "کچھ باتیں کہی نہیں، سمجھی جاتی ہیں"، اسی گھٹن کی طرف اشارہ ہے جو ایک مشترکہ خاندانی نظام میں بہو کے حصے میں آتی ہے۔ وہ اپنے دکھ کا کھلے عام اظہار بھی نہیں کر سکتی کیونکہ معاشرتی اقدار اس کی اجازت نہیں دیتیں اور یہی گھٹن عائلی نظام کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ علی امام نقوی نے اس افسانے میں یہ حقیقت بھی منکشف کی ہے کہ موروثی یا خاندانی رویے کس طرح اگلی نسلوں میں منتقل ہو کر ان کی زندگیوں کا رخ متعین کرتے ہیں۔ یہ رویے لاشعور کے وہ گہرے نقوش ہیں جو فرد کی شخصیت کو تشکیل دیتے ہیں۔ اگر تربیت کے دوران توازن اور آزادی کا خیال نہ رکھا جائے، تو بچے بڑے ہو کر بھی اپنے فیصلوں اور فطری تقاضوں کی ادائیگی میں آزاد نہیں ہو پاتے، جس کی قیمت عموماً ان کی شریکِ حیات کو چکانی پڑتی ہے:

> "یہ افسانہ چار کرداروں بہو، بیٹا، ماں اور ڈاکٹر کو لے کر بُنا گیا ہے۔... ماہر نفسیات تینوں سے باری باری گفتگو کر کے اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ماں جو کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اس کے بے جا احتیاط کی وجہ سے بیٹا نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو گیا ہے اور وہ ہر معاملے میں محتاط رہتا ہے، اسی وجہ سے اولاد سے محروم ہے۔"(7)

اس تجزیے سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ "نقش" محض بانجھ پن کی ایک عام سی کہانی نہیں، بلکہ یہ اس خاندانی المیے کی داستان ہے جہاں والدین کی بے جا مداخلت اور محبت کے نام پر کیا جانے والا جذباتی استحصال اولاد کی زندگی کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ بیٹا جسمانی طور پر تو بالغ ہو چکا ہے، لیکن نفسیاتی طور پر وہ آج بھی اپنی ماں کے اسی حصار میں مقید ہے جس نے اس کی ازدواجی صلاحیتوں کو منجمد کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ افسانہ اس تلخ سماجی حقیقت پر بھی طنز کرتا ہے کہ ہماری نام نہاد تعلیم اور ڈگریاں ہمارے فرسودہ رویوں اور نفسیاتی گرہوں کو کھولنے میں یکسر ناکام ہیں۔ ماں کا کردار پی ایچ ڈی کی ڈگری رکھنے کے باوجود اپنے ہی بیٹے پر 'تیزابی حملے' کر کے اس کی مردانگی اور خود اعتمادی کو چھین چکا ہے۔

اردو افسانوی ادب میں کردار نگاری کا وہ پہلو ہمیشہ سے تنقید نگاروں کی توجہ کا مرکز رہا ہے جہاں انسانی شخصیت کے ظاہر اور باطن کا شدید تضاد کھل کر سامنے

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

آتا ہے۔ علی امام نقوی کے افسانہ 'نقش' میں ساس کا کردار ایک ایسی ہی پیچیدہ اور تہہ دار نفسیاتی گتھی ہے، جو عصری معاشرے کے ایک بہت بڑے المیے کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ یہ المیہ محض ایک فرد کا نہیں بلکہ اس پورے سماجی ڈھانچے کا ہے جہاں اعلیٰ تعلیم اور ڈگریاں انسان کی فکری بلوغت کی ضمانت نہیں بن پاتیں اور روایتی ذہنیت تعلیمی اسناد کے دبیز پردوں کے پیچھے بھی پوری شدت سے کارفرما رہتی ہے۔

اس افسانے میں ساس کا کردار ایک ایسی خاتون کا ہے جس نے میڈیکل بائیو کیمسٹری میں ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی کی اعلیٰ ترین اسناد حاصل کر رکھی ہیں۔ بظاہر یہ توقع کی جاتی ہے کہ سائنس اور کیمیا کے اتنے اعلیٰ درجے کے علوم سے وابستہ ایک عورت زندگی کے حقائق کو نہایت عقلی، منطقی اور متوازن انداز میں سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہو گی۔ لیکن افسانے کا ارتقائی سفر اس خام خیالی کو پاش پاش کر دیتا ہے، کیونکہ اس کا طرزِ عمل ایک انتہائی روایتی، قدامت پسند اور جابر ساس سے ذرہ برابر بھی مختلف نہیں، جس کی زندگی کا واحد مقصد اپنے بیٹے کی خاندانی نسل کو آگے بڑھانا اور بہو کو محض ایک آلے کے طور پر دیکھنا ہے۔

افسانہ نگار نے نہایت چابک دستی سے اس حقیقت کو منکشف کیا ہے کہ مشرق کے عائلی نظام میں 'ساس' کا روایتی تصور کس قدر گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب ایک عورت، چاہے وہ کتنی ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو، ساس کے منصب پر فائز ہوتی ہے، تو اس کے لاشعور میں صدیوں سے رائج وہ جاگیر دارانہ اور پدرسری نظام بیدار ہو جاتا ہے جو اسے گھر کی مطلق العنان حاکم بننے پر اکساتا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو اپنی ملکیت سمجھتی ہے اور اس کی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے قابو میں رکھنے کی نفسیاتی ضرورت محسوس کرتی ہے۔

ڈاکٹر کے کلینک میں اس خاتون کا رویہ اس کی اندرونی گھبراہٹ اور جھوٹی انا کا غماز ہے۔ وہ مسکرانے کی مصنوعی کوشش کرتی ہے اور گفتگو کا آغاز ہی میڈیکل رپورٹس کی فائل آگے بڑھا کر کرتی ہے۔ یہ دراصل اس کی وہ نفسیاتی ڈھال ہے جس کے ذریعے وہ ڈاکٹر پر اور خود اپنے آپ پر یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ مسئلہ خالصتاً جسمانی یا طبی ہے اور اس میں اس کی پرورش یا خاندانی ماحول کا کوئی قصور نہیں۔ وہ ایلوپیتھی کی رپورٹس کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے تاکہ کوئی اس کے مسلط کردہ خاندانی نظام پر انگلی نہ اٹھا سکے۔ یہاں تعلیم اور روایتی ذہنیت کا وہ ہولناک تصادم سامنے آتا ہے جہاں علم انسان کو وسعتِ قلبی عطا کرنے کے بجائے اس کی انانیت کو مزید پختہ کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر جب اس کی علمی قابلیت پر سوال اٹھاتے ہوئے اسے کائنات کے 'جوڑے' کی شکل میں پیدا ہونے کا فلسفہ سمجھاتا ہے، تو اس کے اندر کی روایتی عورت فوراً دفاعی خول میں چلی جاتی ہے۔ وہ اس بات پر برہم ہوتی ہے کہ ایک ڈاکٹر اس کے علم اور اس کی ممتا کو کٹہرے میں کھڑا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر نہایت سفاکی سے اس کی اس نام نہاد تعلیم کے پرخچے اڑاتا ہے جس نے اسے رشتوں کی نزاکت سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑا:

> "بیشتر پڑھے لکھوں کی طرح بس ضرورتاً ہی آپ نے پڑھ لکھ لیا ہے۔ اگر آپ نے واقعتاً علم حاصل کیا ہوتا تو اپنی ذرا سی تکلیف کی وجہ سے ننھے سے وجود پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ بھی آپ کو یاد رہتا کہ ابھی صرف مچلنا اور رونا ہی اس کے اختیار میں ہے۔ اس کی زبان بولنے پر قادر نہیں مگر اس کے کانوں کے دریچے کھلے ہوئے ہیں۔ اور وہیں کہیں آس پاس ہی حافظے کا مسکن بھی ہے۔"(8)

ڈاکٹر کے اس بے باک تجزیے نے اس خاتون کی نفسیاتی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہاں یہ عقدہ کھلتا ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کے بچپن میں اپنی غیر ضروری حساسیت اور حد سے بڑھی ہوئی احتیاط کے ذریعے اس کے ذہن پر جو 'تیزابی حملے' کیے تھے، اسی نے آج اس کے بیٹے کو ایک نامرد اور نفسیاتی طور پر مفلوج انسان بنا دیا ہے۔ اس کا تعلیم یافتہ ہونا اس کے لیے ایک فیشن یا سماجی رتبے کی علامت تو ہو سکتا ہے، لیکن اس نے ممتا کے نام پر اپنے بچے کا جو جذباتی استحصال کیا، وہ اس کی روایتی اور جابرانہ ذہنیت کا ہی شاخسانہ ہے۔

فرائڈین نفسیات کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس خاتون کا کردار 'فوق الانا' (Super Ego) کے شدید دباؤ کی ایک کلاسیکی مثال ہے۔ اس پر سماج کا یہ دباؤ مسلط ہے کہ شادی کے بعد جلد از جلد گھر میں پوتے کی کلکاریاں گونجنی چاہئیں۔ وہ اسی سماجی دباؤ کو اپنے بیٹے اور بہو پر منتقل کر دیتی ہے۔ اس کی پوری توجہ اس بات پر مرکوز ہے کہ معاشرے کو کیا جواب دیا جائے گا، جبکہ وہ ان دو افراد کی جنسی، جذباتی اور ذہنی ضروریات سے یکسر آنکھیں چرا لیتی ہے۔ یہ وہ روایتی سوچ ہے جو نسل در نسل مشرقی گھرانوں میں منتقل ہوتی آ رہی ہے۔

اپنی انا کی تسکین اور سماجی دباؤ سے بچنے کے لیے وہ مختلف ڈاکٹروں کے چکر کاٹتی ہے، رپورٹیں بنواتی ہے تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ طبی لحاظ سے کوئی خامی نہیں۔ لیکن وہ یہ تسلیم کرنے کو قطعی تیار نہیں کہ اصل بیماری اس کے بنائے ہوئے اس گھٹن زدہ ماحول میں ہے جس نے بیٹے کو ایک ڈرا سہما وجود بنا دیا ہے۔ یہ دراصل وہ نفسیاتی کیفیت ہے جسے علمِ نفسیات میں پروجیکشن (Projection) کہا جاتا ہے، جہاں انسان اپنی خامیوں اور احساسِ جرم کو دوسروں پر یا بیرونی اسباب پر منتقل کر دیتا ہے۔ ایسی

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

شخصیات جب کسی بحران کا شکار ہوتی ہیں تو ان کے اندر کا سائنسی اور عقلی انسان فوراً پسپا ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک خوفزدہ، روایتی اور توہم پرست انسان لے لیتا ہے۔ وہ بائیو کیمسٹری کی پی ایچ ڈی ہو کر بھی اپنے بیٹے کے لاشعور کی کیمسٹری کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ اس کی زندگی کا المیہ یہ ہے کہ اس نے کتابوں سے کیمیائی تعاملات تو سیکھ لیے، لیکن دو انسانوں کے درمیان پروان چڑھنے والے جذباتی اور نفسیاتی تعاملات سے وہ بالکل کوری رہی۔

علمِ نفسیات ہمیں بتاتا ہے کہ انسان جب بھی کسی شدید داخلی تصادم کا شکار ہوتا ہے، تو وہ لاشعوری طور پر کچھ ایسے دفاعی حکمت عملی وضع کر لیتا ہے جو اس کی جھوٹی انا کو سہارا فراہم کرتے ہیں۔ ساس کا یہ کردار بھی اسی ذہنی کشمکش سے گزر رہا ہے جہاں اسے اپنی غلط تربیت کا ادراک تو کہیں نہ کہیں لاشعور میں موجود ہے، مگر وہ اسے شعور کی سطح پر لانے سے گریزاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کلینک میں ڈاکٹر کی باتوں پر تلملا اٹھتی ہے اور اسے بے ہودہ قرار دیتی ہے:

> "نفسیاتی تحقیقوں نے اس نظریے پر حقیقت کی مہر ثبت کر دی ہے کہ انسانی فطرت نہ سفید ہے نہ سیاہ... نفسیات کی اہم دریافتوں میں چند ایسی دفاعی تدبیریں بھی ہیں جن کے فہم و ادراک کے بغیر ہم نہ صرف مریضانہ کردار کی کیفیتوں بلکہ روزمرہ زندگی کی ان لغزشوں، حماقتوں اور مغالطوں کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے جن کے ہم اکثر بے سوچے سمجھے شکار ہو جاتے ہیں۔"(9)

ساس کی یہ دفاعی تدبیریں، جن کا ذکر محولہ بالا اقتباس میں کیا گیا ہے، اس کی روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کی مردانہ کمزوری یا نفسیاتی خوف کو میڈیکل رپورٹس کے پلندوں تلے چھپانے کی جو حماقت کر رہی ہے، وہ دراصل اپنے آپ کو سماجی طعنوں سے بچانے کی ایک لاشعوری کوشش ہے۔ وہ یہ جاننا ہی نہیں چاہتی کہ انسان کوئی مشین نہیں جسے دواؤں سے ٹھیک کر لیا جائے، بلکہ وہ ایک پیچیدہ نفسیاتی اکائی ہے۔ ایک حقیقی تعلیم یافتہ ذہن وہ ہوتا ہے جو روایات کی اندھی تقلید کے بجائے صورتحال کا تجزیہ کرے اور اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنے کا حوصلہ رکھے۔ لیکن افسانے کی یہ ساس روایتی ذہنیت کی ان تاریک زنجیروں میں اتنی مضبوطی سے جکڑی ہوئی ہے کہ پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی اس کے ذہن کے دریچے نہیں کھول سکی۔ وہ اسی پرانی ڈگر پر چل رہی ہے جہاں بہو کو محض بچے پیدا کرنے والی مشین سمجھا جاتا ہے اور خاندانی نام کی بقا کے لیے کسی بھی جذباتی رشتے کو قربان کیا جا سکتا ہے۔

اردو فکشن میں ازدواجی رشتوں کی نزاکت اور ان کے پسِ پردہ کارفرما نفسیاتی محرکات کو پیش کرنے کی روایت اگرچہ خاصی پرانی ہے، تاہم علی امام نقوی نے اپنے افسانہ 'نقش' میں جس منفرد زاویے سے میاں بیوی کے درمیانی فاصلوں کی نقش گری کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کہانی کا سب سے المناک اور دلدوز پہلو بیٹے اور بہو کی وہ خاموش اور اذیت ناک زندگی ہے، جو بظاہر ہر طرح کی جسمانی اور مادی آسائشوں سے مزین ہونے کے باوجود اندرونِ ذات ایک ہولناک جنسی اور نفسیاتی ناآسودگی کا شکار ہے۔ یہ ناآسودگی کسی ظاہری بیماری کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ اس لاشعوری کشمکش کا شاخسانہ ہے جس نے دونوں کرداروں کی روح کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔

انسانی لاشعور ایک ایسا تاریک اور پراسرار غار ہے جس میں دفن ہونے والے خوف، وسوسے اور صدمات بعض اوقات انسان کے شعوری ارادوں اور جسمانی افعال پر مکمل طور پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ افسانے میں بیٹے کا کردار ایک ایسے ہی نفسیاتی جبر کا شکار ہے جہاں اس کا جسمانی وجود تو ایک بالغ مرد کا ہے، لیکن اس کا لاشعور آج بھی ایک سہمے ہوئے بچے کی مانند ہے۔ میڈیکل رپورٹس اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ اس کے اندر کوئی جسمانی یا ایلوپیتھک نقص موجود نہیں، لیکن اس کا ذہن ایک ایسی غیر مرئی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے جو اسے اپنی شریکِ حیات کے ساتھ ایک فطری اور صحت مند رشتہ استوار کرنے سے باز رکھتی ہے۔

بیٹے کے اس المیے کی جڑیں اس کے دورِ طفولیت کی اس غیر فطری پرورش میں پیوست ہیں جہاں ماں کی حد سے بڑھی ہوئی حساسیت اور بے جا احتیاط نے اس کی مردانہ جبلتوں کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ بچپن میں ملنے والی یہ 'احتیاط' اس کے ذہن میں ایک ایسا خوف بن کر بیٹھ گئی ہے کہ وہ ازدواجی قربت کے لمحات میں بھی اس لاشعوری خوف سے آزاد نہیں ہو پاتا۔ یہ خوف اس قدر شدید ہے کہ وہ قربت کے عین وقت پر اعصابی اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ اپنی بیوی کی فطری پیاس بجھانے سے قبل ہی شکست کھا جاتا ہے۔

فرائڈین نفسیات کی روشنی میں اگر اس کردار کا جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کے اندر کی فطری جبلت (Id) کو اس کی ماں کی مسلط کردہ اخلاقی و نفسیاتی حاکمیت نے مکمل طور پر دبا دیا ہے۔ وہ جب بھی اپنی بیوی کے قریب جاتا ہے، اس کے لاشعور میں چھپی ہوئی وہ 'احتیاط' ایک رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اسے یہ احساس کھائے جاتا ہے کہ وہ کوئی غلطی کر رہا ہے یا وہ اس عمل کی انجام دہی کے قابل نہیں۔ یہ احساسِ کمتری اور اندرونی خوف اسے ایک ایسے احساسِ جرم میں مبتلا کر دیتا ہے جس کا اظہار اس کے چہرے کی اذیت، ہونٹ چبانے اور نگاہیں چرانے ایسی حرکات سے ہوتا ہے۔

دوسری جانب، بہو کا کردار اس افسانے میں ایک ایسی جیتی جاگتی، صحت مند اور فطری جذبات سے لبریز عورت کا ہے، جسے ایک ایسے صحرا میں لا کر کھڑا کر دیا

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

گیا ہے جہاں سراب کے سوا کچھ نہیں۔ وہ ایک ایسی عورت ہے جس کے اندر زندگی کی رمق، ممتا کی آرزو اور ازدواجی رفاقت کی شدید طلب موجود ہے، لیکن اس کا مقدر ایک ایسا شریکِ حیات بنا دیا گیا ہے جو نفسیاتی طور پر اس کی طلب کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ بہو کی یہ محرومی محض جسمانی نہیں، بلکہ یہ اس کی نسائیت کی توہین اور اس کے وجود کی نفی ہے۔

مشرقی معاشرے کا یہ المیہ رہا ہے کہ یہاں عورت کی جنسی اور جذباتی ضروریات کو ہمیشہ ثانوی یا غیر اہم سمجھا جاتا ہے۔ ایک عورت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہر حال میں 'خاوند کی رضا میں راضی' رہے، چاہے اس کے اندر خواہشات کا کتنا ہی بڑا طوفان کیوں نہ برپا ہو۔ بہو کا کردار اسی گھٹن زدہ معاشرتی روایتی نظام کی عکاسی کرتا ہے جہاں وہ اپنی ناآسودگی کا کھل کر اظہار بھی نہیں کر سکتی۔ وہ اندر ہی اندر سلگ رہی ہے، لیکن اس کے لبوں پر خاموشی کی مہر ثبت ہے۔ بہو کی یہ شدید نفسیاتی اور جنسی ناآسودگی اس کے اندر ایک ایسا طوفان برپا کیے ہوئے ہے جس نے اس کی شخصیت کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس کے اندر کوئی طبی نقص نہیں اور وہ یہ بھی جانتی ہے کہ اس کا شوہر بھی کسی لاعلاج بیماری کا شکار نہیں، بلکہ مسئلہ اس نفسیاتی بلاک کا ہے جس نے ان کے بستر کو ایک سرد خانے میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ سرد مہری اور فاصلہ اس کے لیے ایک مستقل ذہنی اذیت بن چکا ہے، جو اسے آہستہ آہستہ مایوسی اور ڈپریشن کی طرف دھکیل رہا ہے۔

علی امام نقوی نے بہو کی اس شدید جنسی اور نفسیاتی پیاس کو بیان کرنے کے لیے انتہائی بلیغ، شاعرانہ اور استعاراتی زبان کا سہارا لیا ہے۔ وہ عورت کے جسم کو ایک ایسی زرخیز زمین سے تشبیہ دیتے ہیں جو اپنے اندر زندگی پیدا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے، لیکن اس صلاحیت کو بیدار کرنے کے لیے اسے ایک ایسے بادل کی ضرورت ہے جو اس کی پیاس بجھا سکے۔ افسانے میں بہو اپنے درد کو ڈاکٹر کے سامنے نہایت رمزیہ مگر دلخراش انداز میں بیان کرتی ہے:

"زمین..... ہاں زمین.... ڈاکٹر صاحب اس زمین سے چشمہ اُبلتا ہے مگر اس کی اپنی پیاس تو بادل کے برسنے ہی سے بجھے گی۔... میرا گھنا.... گھنگور ابر..... زمین کے بجائے پلنگ کی چادر پہ برستا ہے۔"(10)

یہ استعارہ اردو فکشن میں جنسی ناآسودگی اور مردانہ نفسیاتی کمزوری کی نہایت کاٹ دار اور فنی تصویر کشی ہے۔ 'ابر کا زمین کے بجائے پلنگ کی چادر پر برسنا' دراصل شوہر کی اس نفسیاتی کمزوری (Premature Ejaculation) کی طرف اشارہ ہے جو اس کے لاشعوری خوف اور حد سے بڑھی ہوئی احتیاط کا نتیجہ ہے۔ عورت کا وجود وہ پیاسی زمین ہے جو سیراب ہونے کی منتظر ہے، لیکن شوہر کا نفسیاتی دباؤ اسے اس منزل تک پہنچنے ہی نہیں دیتا اور یوں وہ بارش جو زمین کو سرسبز کر سکتی تھی، محض چادر کو داغدار کر کے ضائع ہو جاتی ہے۔

اس شدید ناآسودگی نے میاں بیوی کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل کر دی ہے جسے پاٹنا دونوں کے لیے ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ شوہر اپنی اس کمی کے باعث شدید احساسِ ندامت اور احساسِ جرم کا شکار ہے، جبکہ بیوی اپنی مسلسل محرومی کے باعث ایک خاموش غصے اور بیزاری میں مبتلا ہے۔ یہ دونوں ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی جذباتی طور پر ایک دوسرے سے کوسوں دور ہو چکے ہیں۔ ان کے درمیان مکالمے کا فقدان ہے، کیونکہ جس مسئلے پر بات ہونی چاہیے، وہ معاشرتی شرم اور انا کے پردوں میں چھپا ہوا ہے۔

بیٹے کا فراری رویہ اس کی داخلی شکست خوردگی کا واضح ثبوت ہے۔ جب ڈاکٹر کلینک میں ان سے سوالات کرتا ہے، تو بیٹے کی بے دلی اور اس کا اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبانا، اس شدید ذہنی اذیت کی غمازی کرتا ہے جس سے وہ گزر رہا ہے۔ وہ حقیقت کا سامنا کرنے سے ڈرتا ہے اور چاہتا ہے کہ کوئی اور (اس کی ماں یا بیوی) اس مسئلے کو حل کر دے، کیونکہ وہ خود نفسیاتی طور پر اس قدر مفلوج ہو چکا ہے کہ اپنے وجود کا دفاع کرنے کی صلاحیت بھی کھو بیٹھا ہے۔ یہاں دو مختلف نوعیت کے المیے بیک وقت چل رہے ہیں۔ ایک طرف وہ مرد ہے جو بظاہر حاکمیت کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود اپنے ہی لاشعور کا غلام ہے اور دوسری طرف وہ عورت ہے جو زندگی کی تمام تر حرارت رکھنے کے باوجود ایک مردہ رشتے کی لاش ڈھونے پر مجبور ہے۔ ان دونوں کی کشمکش کا نقطۂ عروج وہ تنہائی ہے جو ہجوم میں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ یہ تنہائی ان کے اعصاب کو چاٹ رہی ہے اور ان کی شخصیت کے مثبت پہلوؤں کو دیمک کی طرح کھا رہی ہے۔

ڈاکٹر، جو اس افسانے میں ایک ماہرِ نفسیات کے فرائض انجام دے رہا ہے، اس پورے منظرنامے کو بخوبی بھانپ لیتا ہے۔ وہ ان لیبارٹری رپورٹس کو مسترد کر دیتا ہے جو جسمانی صحت کا سرٹیفکیٹ بانٹ رہی ہیں اور اپنی توجہ ان نفسیاتی گرہوں پر مرکوز کرتا ہے جو اس رشتے کی تباہی کا اصل سبب ہیں۔ ڈاکٹر سمجھ جاتا ہے کہ یہ معاملہ ادویات کا نہیں، بلکہ اس خوف کو دور کرنے کا ہے جو ماں کی بے جا حساسیت نے بیٹے کے ذہن میں بٹھا دیا ہے اور جس کا خمیازہ بہو کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ڈاکٹر اس پیچیدہ مثلث کی تشریح کرتے ہوئے مسئلے کی اصل جڑ کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے، جو نہ صرف بیٹے کی نفسیاتی الجھن کو واضح کرتے ہیں، بلکہ بہو کی ناآسودگی کے اسباب پر بھی روشنی ڈالتے ہیں:

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

"اس کی احتیاط، آپ کا ارمان اور آپ کی بہو کی ضرورت، یہی تو مسئلہ ہے۔... جس کے باعث آپ کے شوہر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی احتیاط برت رہے ہیں۔"(11)

عائلی رشتوں میں جب تک نفسیاتی اور جذباتی ہم آہنگی پیدا نہ ہو، کوئی بھی رشتہ اپنی طبعی عمر پوری نہیں کر سکتا۔ علی امام نقوی نے اس افسانے کے ذریعے نہایت خوبی سے یہ پیغام دیا ہے کہ جنسی ناآسودگی محض ایک جسمانی محرومی نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسا شدید نفسیاتی عارضہ ہے جو انسان کی پوری شخصیت، اس کے اعتماد اور اس کی سماجی زندگی کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ بیٹے کی 'ضرورت سے زیادہ احتیاط' اور بہو کی 'ضرورت' کے درمیان جو خوفناک تصادم ہے، وہ درحقیقت انسانی جبلتوں کو غیر فطری دباؤ کے تحت کچلنے کا وہ اندوہناک نتیجہ ہے، جو خاندانی نظام کی عمارت کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر کے اسے شکست وریخت کے ایک ایسے دہانے پر لا کھڑا کرتا ہے جہاں سے واپسی کا سفر انتہائی کٹھن اور دشوار گزار ہو جاتا ہے۔

اعلیٰ پائے کا افسانوی ادب کبھی بھی کسی ایک فرد، خاندان یا مخصوص واقعے کے تنگ دائرے تک محدود نہیں رہتا، بلکہ وہ اپنے اندر پورے عہد کی دھڑکن اور معاشرے کی مجموعی نفسیات کو سمو لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ علی امام نقوی کا افسانہ 'نقش' بظاہر ایک کلینک کے کمرے اور ایک فلیٹ کی چار دیواری میں محصور تین افراد کی کہانی معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر اس کے باطنی اور فکری تانے بانے کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو یہ ایک پورے معاشرے کی کھوکھلی اقدار، فرسودہ روایات اور اجتماعی نفسیاتی زوال کا ایک وسیع کینوس بن کر ابھرتا ہے۔ اس افسانے کا اصل کمال یہ ہے کہ یہ مائیکرو (انفرادی) سطح پر کہانی بیان کرتے ہوئے میکرو (اجتماعی) سطح کے المیوں کی نہایت سفاکانہ اور معروضی نقاب کشائی کرتا ہے۔

کسی بھی معاشرے کا عائلی نظام دراصل اس کی اجتماعی نفسیات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس افسانے میں پیش کردہ خاندان ہمارے برصغیر کے اس مڈل اور اپر مڈل کلاس طبقے کا نمائندہ ہے، جو بظاہر تو جدیدیت، اعلیٰ تعلیم اور مادی آسائشوں کے خول میں لپٹا ہوا ہے، لیکن اندرونِ ذات وہ انہی بوسیدہ اور گھٹن زدہ رویوں کا اسیر ہے جو صدیوں سے ہماری تہذیب کی رگوں میں سرایت کر چکے ہیں۔ نقوی صاحب نے نہایت ہنرمندی سے یہ واضح کیا ہے کہ جب ایک پورا معاشرہ نفسیاتی طور پر بیمار ہو جائے، تو اس کی اکائیاں (خاندان) بھلا کس طرح صحت مند رہ سکتی ہیں۔

یہ افسانہ ہمیں کارل یونگ کے اس نظریے کی طرف لے جاتا ہے جسے 'اجتماعی لاشعور' کہا جاتا ہے۔ افسانے کے کرداروں، بالخصوص ماں کے رویے کو صرف اس کی انفرادی جہالت قرار دے کر رد نہیں کیا جا سکتا۔ درحقیقت وہ ان تمام سماجی دباؤ، خاندانی توقعات اور صدیوں سے رائج ان توہمات کا شکار ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل میں بغیر کسی سوال کے منتقل ہوتے آ رہے ہیں۔ اس کا رویہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ جب معاشرے کا مجموعی مزاج جبر پر مبنی ہو، تو تعلیم یافتہ ذہن بھی اس لاشعوری دباؤ کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے:

"اجتماعی لاشعور میں ان تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے جو کہ انسان ہزاروں سال سے کرتا چلا آ رہا ہے۔ ان تجربات کے نچوڑ کو ژنگ نے نخست مثال (Archetype) کا نام دیا۔... یہ عناصر کوئی فرد اپنی زندگی کے دوران اکتسابی طور پر حاصل نہیں کرتا بلکہ وہ ورثے میں ملے ہوئے جبلی سانچے ہیں۔"(12)

محولہ بالا نظریے کی روشنی میں یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ افسانے میں ساس کا 'حاکمانہ اور محتاط' رویہ دراصل اسی سماجی ورثے کی دین ہے جس نے عورت کو ایک خاص سانچے میں سوچنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ ہمارے مشرقی معاشرے کا یہ اجتماعی المیہ ہے کہ یہاں شادی کو دو افراد کی جذباتی اور ذہنی ہم آہنگی کا نام دینے کے بجائے اسے محض 'خاندانی وارث' پیدا کرنے کا ایک ادارہ سمجھ لیا گیا ہے۔ اولاد کے حصول کی یہ اندھی اور بے تحاشا خواہش، جو پورے خاندان کو نفسیاتی دباؤ میں مبتلا کر دیتی ہے، کسی ایک گھر کی نہیں بلکہ ہمارے پورے سماجی ڈھانچے کی بیماری ہے۔

اس وسیع تر سماجی کینوس پر ایک اور ہولناک حقیقت جو یہ افسانہ منکشف کرتا ہے، وہ معاشرے میں مردانگی کے فرسودہ تصورات ہیں۔ ہم عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ پدرسری نظام میں صرف عورت ہی جبر کا شکار ہوتی ہے، لیکن 'نقش' کا بیٹا اس بات کا ثبوت ہے کہ معاشرتی توقعات اور مسلط کردہ خاندانی اصول کس طرح ایک مرد کو بھی نفسیاتی اور جذباتی طور پر مفلوج کر سکتے ہیں۔ اسے بچپن سے جس 'احتیاط' کی زنجیروں میں جکڑا گیا، اس نے معاشرے کے اس بھیانک چہرے کو بے نقاب کر دیا ہے جو اپنے بچوں کو ایک آزاد فرد بننے کے بجائے اپنے ارمانوں کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔

عورت کی خاموشی اور اس کی ضروریات کی نفی، جو بہو کے کردار سے ظاہر ہوتی ہے، بھی ایک انفرادی دکھ نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کی اجتماعی نفسیات کا ایک تاریک باب ہے۔ ایک ایسی سوسائٹی جہاں عورت کے فطری اور جنسی جذبات پر بات کرنا ایک ناقابلِ معافی جرم یا 'ٹیبو' (Taboo) سمجھا جاتا ہو، وہاں ہزاروں

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

لڑکیاں اسی طرح کی گھٹن میں خاموشی سے اپنی زندگیاں گزار دیتی ہیں۔ نقوی نے بہو کے کردار کے ذریعے اس پوری صنف کی آواز کو زبان دی ہے جسے مشرقی شرم وحیا کے نام پر زندہ درگور کر دیا جاتا ہے۔

افسانے کا ایک اور انتہائی اہم سماجی پہلو نفسیاتی امراض کے تئیں ہماری سوسائٹی کا مجرمانہ اور جاہلانہ رویہ ہے۔ ہم جسمانی بیماریوں کے لیے تو لاکھوں روپے خرچ کر کے لیبارٹریوں کے چکر کاٹنے کو تیار رہتے ہیں، کیونکہ ایلوپیتھک علاج معاشرے میں قابلِ قبول ہے، لیکن ہم یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتے کہ ہمارے ذہن اور رویے بھی بیمار ہو سکتے ہیں۔ نفسیاتی علاج یا 'تھراپی' کو پاگل پن سے منسوب کرنے کی جو اجتماعی روش ہمارے ہاں رائج ہے، افسانہ نگار نے ڈاکٹر اور مریضوں کے مکالمے کے ذریعے اس پر بھرپور تنقید کی ہے۔

علی امام نقوی کا یہ افسانہ دراصل ایک سماجی آئینہ ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ ہم ایک ایسے ہجوم میں تبدیل ہو چکے ہیں جو ظاہری نمود و نمائش، ڈگریوں اور اسٹیٹس کے پیچھے تو بھاگ رہا ہے، لیکن اندرونی طور پر وہ عدم برداشت، شک اور خوف کی دلدل میں دھنس چکا ہے۔ افسانے کے کرداروں کے درمیان مکالمے کا فقدان ہمارے معاشرے میں بڑھتی ہوئی اس خلیج کا استعارہ ہے جہاں لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر بھی ایک دوسرے سے کوسوں دور ہیں۔ ہم نے اپنے گھروں کو کنکریٹ کی عمارتوں میں تو بدل دیا ہے، لیکن ان میں سے انسانی ہمدردی اور باہمی تفہیم کا اخراج ہو چکا ہے۔ یہ افسانہ اس عصری فکشن کی اس لہر کا حصہ ہے جس نے ترقی پسند تحریک کے معاشی اور طبقاتی نعروں سے آگے بڑھ کر انسان کی انفرادی اور اجتماعی ذات کے اندرونی بحرانوں کو کھنگالنے کی جرات کی ہے۔ اکیسویں صدی کے افسانہ نگاروں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ انسان کا اصل دشمن اب کوئی بیرونی استعمار یا جاگیر دار نہیں، بلکہ اس کی اپنی ذات کے اندر پلنے والے وہ خوف اور تضادات ہیں جو اسے ایک نارمل انسان بننے سے روک رہے ہیں:

> "ہم عصر افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں انسانی زندگی کے حقائق، سیاسی و سماجی زندگی کے تضادات، اقدار کا زوال، خوف و دہشت، معاشی ناہمواری، مہنگائی، بے حسی اور انسانی کشمکش کی عکاسی پائی جاتی ہے۔ رواں صدی میں لکھے جا رہے افسانوں کے جائزہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ دور کہانیوں کے اعتبار سے گزشتہ ادوار کے مقابلے میں کہیں زیادہ زرخیز ہے۔"(13)

علی امام نقوی کا افسانہ 'نقش' محولہ بالا تحقیقی مشاہدے کی ایک انتہائی روشن اور توانا مثال ہے۔ اس افسانے میں اقدار کا زوال اور بے حسی کسی میدانِ جنگ یا سیاسی پلیٹ فارم پر نہیں، بلکہ گھر کے ڈرائنگ روم میں دکھائی گئی ہے۔ یہ دراصل اس خاموش سماجی جنگ کی تصویر ہے جہاں خونی رشتے ہی ایک دوسرے کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن چکے ہیں۔ نقوی صاحب نے کمال فنکاری سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہماری معاشرتی اکائیاں اندر سے کس قدر خوفزدہ اور اپنی ہی بنائی ہوئی روایات کے بوجھ تلے دب چکی ہیں۔

الغرض، 'نقش' ایک ایسا شاہکار ہے جو محض چند صفحات پر محیط ہونے کے باوجود ہمارے پورے معاشرتی نظام کی ایک جامع چارج شیٹ ہے۔ علی امام نقوی نے ایک کلینکل ماہرِ نفسیات کے انداز میں ہمارے سماج کی نبض پر ہاتھ رکھا ہے اور یہ تلخ سچائی بیان کی ہے کہ ہماری ظاہری چمک دمک کے پیچھے ایک ایسا مریض معاشرہ کراہ رہا ہے جسے دواؤں سے زیادہ، ہمدردی، درگزر اور ایک دوسرے کی نفسیاتی آزادی کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ افسانہ ایک سماجی نوحہ بھی ہے اور ایک بیداری کا پیغام بھی، جو قاری کو اپنے رویوں کا محاسبہ کرنے کی ایک کھلی دعوت دیتا ہے۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

حوالہ جات

1. نازیہ ظہور، پاکستانی خواتین افسانہ نگاروں کے اردو افسانوں کا نفسیاتی مطالعہ، مقالہ برائے ایم فل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، 2018ء، ص199
2. ڈاکٹر محمد محسن، نفسیاتی اسکول کے افسانے، مشمولہ: ماہنامہ زبان و ادب، بہار اردو اکادمی، پٹنہ، مئی جون 1981ء، ص4
3. ڈاکٹر عبید اللہ چودھری، اتر پردیش میں اردو افسانہ؛ 1960ء کے بعد آفسیٹ پریس گورکھپور، 1993ء، ص150
4. طفیل احمد، اکیسویں صدی میں اردو افسانہ، مشمولہ: اردو ریسرچ جرنل، شمارہ 26، دہلی یونیورسٹی، 2021ء، ص174
5. علی امام نقوی، کہی ان کہی (افسانے)، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، 2012ء، ص18
6. مبین عنایت، اکیسویں صدی کے اردو افسانے میں سماجی اور نفسیاتی مسائل کی عکاسی، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، 2025ء، ص73
7. طفیل احمد، اکیسویں صدی میں اردو افسانہ (موضوعات کے حوالے سے)، ص187
8. علی امام نقوی، کہی ان کہی (افسانے)، ص24
9. ڈاکٹر محمد محسن، نفسیاتی اسکول کے افسانے، ص6
10. علی امام نقوی، کہی ان کہی (افسانے)، ص26
11. ایضاً، ص27–28
12. ڈاکٹر عبد الکریم خالد، ممتاز مفتی کے افسانوی ادب میں نفسیات نگاری، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، جامعہ پنجاب لاہور، 2004ء، ص385–386
13. طفیل احمد، اکیسویں صدی میں اردو افسانہ (موضوعات کے حوالے سے)، ص191

Hawala Jaat

1. Nazia Zahoor, *Pakistani Khawateen Afsana Nigaron ke Urdu Afsanon ka Nafsiati Mutala* (MPhil thesis, Allama Iqbal Open University, Islamabad, 2018), p. 199.
2. Dr. Muhammad Mohsin, "Nafsiati School ke Afsane," *Mahnama Zaban o Adab*, Bihar Urdu Academy, Patna, May–June 1981, p. 4.
3. Dr. Ubaidullah Chaudhry, *Uttar Pradesh mein Urdu Afsana: 1960 ke Baad*, Offset Press, Gorakhpur, 1993, p. 150.
4. Tufail Ahmad, "Ikkiswin Sadi mein Urdu Afsana," *Urdu Research Journal*, no. 26, University of Delhi, 2021, p. 174.
5. Ali Imam Naqvi, *Kahi An Kahi (Afsane)*, Takhleeq Kar Publishers, Delhi, 2012, p. 18.
6. Mubeen Inayat, *Ikkiswin Sadi ke Urdu Afsane mein Samaji aur Nafsiati Masail ki Akkasi* (PhD diss., National University of Modern Languages, Islamabad, 2025), p. 73.
7. Tufail Ahmad, "Ikkiswin Sadi mein Urdu Afsana (Mozuaat ke Hawale se)," ibid., p. 187.
8. Ali Imam Naqvi, *Kahi An Kahi (Afsane)*, p. 24.
9. Dr. Muhammad Mohsin, "Nafsiati School ke Afsane", p. 6.
10. Ali Imam Naqvi, *Kahi An Kahi (Afsane)*, p. 26.
11. Ibid., pp. 27–28.
12. Dr. Abdul Karim Khalid, *Mumtaz Mufti ke Afsanvi Adab mein Nafsiat Nigari* (PhD diss., University of the Punjab, Lahore, 2004), pp. 385–386.
13. Tufail Ahmad, "Ikkiswin Sadi mein Urdu Afsana (Mozuaat ke Hawale se)," ibid., p. 191.